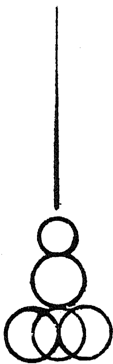
زینہ زینہ راکھ



غیاث متین

○ اشاعت : پہلی بار، جنوری ۱۹۸۰ء
○ تعداد : ایک ہزار
○ قیمت : دس روپے (ہندوستان کے لیے)
ریال : عشرہ (مشرقِ وسطیٰ کے لیے)
5 ڈالر : (دیگر ممالک کے لیے)

○ خوشنویسی : سلام خوشنویس
۱۷-۱-۲۲ جناوِلا، روبرو زہرا ہاسپٹل دارالشفاء
حیدرآباد ۵۰۰۰۲۴
○ تزئینِ سرورق : اعظم راہی
○ ناشر : حیدرآباد لٹریری فورم "حلف"
○ زیرِ اہتمام : اِدارۂ پیکر، حیدرآباد
○ مطبع : اِکسل فائن آرٹ لیتھو اینڈ آفسیٹ ورکس
محبوب چوک، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
○ بلاک سازی و طباعتِ سرورق :
ڈالٹن پریس، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

○ معاونت : جزوی { اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش، حیدرآباد
ایچ۔ای۔ایچ دی نظامس اُردو ٹرسٹ

مِلنے کے پتے :
○ بک ڈپو، اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش، حیدرآباد۔ اے سی گارڈز۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴
○ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ دہلی۔ بمبئی۔ علی گڑھ
○ الیاس ٹریڈرس، شاہ علی بنڈہ۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
○ احمد علی نیوز پیپر ایجنٹ، عابد سرکل۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
○ شب خون کتاب گھر 313 رانی منڈی، الٰہ آباد ۳
○ ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی۔ علیگڑھ
○ مُصنّف : مکان نمبر 16-8-544 جدید ملک پیٹ۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۳۶

جدید اظہار

کے

نام

عاتق شاہ

ماجد شاہ

اور

ساجد شاہ

اپنے اِن تینوں ماموؤں کی نذر

جن کی شفقت آج بھی میرے وجود کا ایک حصہ ہے

زینہ



زینہ

سُن تو سہی !

میری شاعری علامتی سوچ کا اظہار ہے۔ اپنی شاعری کے انیس بیس سالہ سفر کے دوران، میں نے کوئی جست نہیں لگائی، بلکہ بیانیہ سے گزر کر، اپنے عصر کی آواز کو پہچاننے، اُسے اپنے میں جذب کرنے اور برتنے میں ہر قدم پر راکھ ہوا ہوں، تب کہیں یہ شعری مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں پہنچا ہے۔

شاعری میرے نزدیک پردہ ہٹانا ہے اُن چیزوں پر سے، جو صرف مجھے دکھائی دیتی ہیں کسی اور کو نہیں، جنھیں صرف مَیں دیکھ سکتا ہوں کوئی دوسرا نہیں ــــ اور جب مَیں اُن چیزوں پر سے پردہ ہٹاتا ہوں تو وہ بولتی ہوئی باہر نکلتی ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ خود اپنا اظہار لیے باہر آتی ہیں اور یہ اظہار میرے عصر کے اظہار سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ (میرے نزدیک نہ صرف خود اپنے لیے بلکہ کسی اور کے لیے شعر کہنے کا جواز اُس وقت تک پیدا نہیں ہوتا، جب تک کہ اُس کا اظہار، اپنے عصر کے اظہار سے ہم آہنگ نہ ہو) جبھی تو یہ چیزیں، تصویریں اور پیکر قاری کو دیکھے بھالے محسوس ہوتے ہیں ــــ وہ ان کی دید اور گفتگو سے محظوظ ہوتا اور اُنھیں اپنے حواس سے محسوس کرلیتا ہے اور اگر اُسے کہیں کوئی بُعد دکھائی دیتا ہے تو اس کی وجہ ہے میرے شعور اور لاشعور کا تصادم۔

میرے لاشعور میں، پتہ نہیں کیا کیا کچھ، انتہائی بے ترتیبی اور بے ربطی سے گڈمڈ ہے ــــ اُس میں واقعات و حادثات، یادیں اور تصویریں، اشکال و پیکر، ماضی، حال، مستقبل، زمان و مکاں ــــ ماورائے زمان و مکاں سبھی، کچھ اس طرح یکجا اور متصادم ہیں کہ ان کا سرا خود میرے شعور کی گرفت میں نہیں آتا۔ اور یہ سب چیزیں جب بیک وقت اپنی پوری قوت اور تیز رفتاری کے ساتھ شعور میں آنا چاہتی ہیں تو میرا شعور، اُسی قوت سے انھیں سہار نہیں سکتا۔ نتیجہ یہ کہ وہ میرے شعور میں آتے آتے ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں اور میں انھیں ویسا ہی چھوڑ دیتا ہوں ــــ یہی وجہ ہے کہ میرے ہاں احساس کسی تسلسل میں نہیں بلکہ اُس سے کٹ کر، الگ الگ ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے اور میں اپنے اِس تجربے کو نظم کا نام دے لیتا ہوں ــــ آپ چاہیں تو اسے اِنتشار کہہ لیں۔

مَیں جذبات کے ذریعہ نہیں لکھتا، بلکہ الفاظ کے ذریعہ لکھتا ہوں یعنی یہ کہ تجربے کو الفاظ کی شکل میں محسوس کرتا اور لہجہ کے ذریعہ اس کے اظہار کی سکت رکھتا ہوں۔ ویسے بھی جذبہ آج اتنا اہم نہیں جتنا کہ احساس ــــ آج کی ادبی فضا محسوس تجربات کی حامل ہے۔ میرا احساس کسی ایک موضوع کا پابند نہیں ــــ وہ شعور کی رَو میں بہہ کر، بیشتر اوقات ایک سے زیادہ موضوعات کا احاطہ کرلیتا ہے ــــ اس طرح میری بعض نظمیں بیک وقت ایک سے زیادہ موضوعات کا اظہار کرتی ہوئی ملیں گی۔

اپنی شاعری میں، مَیں نے زیادہ تر اپنے آپ ہی سے گفتگو کی ہے۔ کہیں خود کلامی اور ہم کلامی ہے تو کہیں خود مَیں ایک ایسا کردار بن گیا ہوں جو کسی دوسرے کردار سے (جو بظاہر نظر نہیں آتا) مخاطب ہے۔ اس کے علاوہ کہیں میرا مخاطب "زمانہ" ہے کہیں "وقت" اور کہیں میری ہی طرح کے دوسرے کردار ــــ

"وقت" کا عرفان، میری شاعری کی پہچان کا وسیلہ بن سکتا ہے ــــ ممکن ہے کہ اسے مستحکم ہونے کے لیے ابھی کچھ اور وقت لگے۔ لیکن اس راکھ میں وہ چنگاری چھپی ہوئی ضرور ہے جس کی تلاش دیدۂ بینا کے لیے مشکل نہیں۔

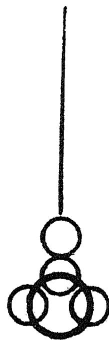
یوں تو شاعری مجھے ورثے میں ملی ہے، لیکن ذہن اپنے ماحول، عصر اور (ہندوستان کے چند اہم شعراء کے علاوہ) حیدرآباد کے جدید طرزِ فکر کے اُن شاعر دوستوں کی رفاقت سے بنا ہے، جو سانس کی طرح میرے ساتھ رہے ہیں۔ ان میں مغنی تبسم، حکیم یوسف حسین خاں (مرحوم) راشد آذر، تاج مہجور اور مضطر مجاز (مجھ سے پہلے سے شعر کہہ رہے ہیں) مُصحف اقبال توصیفی، رؤف خلش، حسن فرخ، مسعود عابد، رؤف خیر، مجاہد الانصاری اور کیف رضوانی (میرے ساتھ شعر گوئی کا آغاز کرنے والوں میں شامل ہیں) علی ظہیر، علی الدین نوید، اسلم عمادی علی اصغر، باذل عباسی، یوسف اعظمی، یوسف کمال، بشارت علی، اعظم راہی اور حلیم ماجد (میرے بعد شعر کہنے والوں میں شامل ہیں) اِن تمام کی شب و روز کی صحبتوں، بحث و مباحثوں، مخصوص شعری نشستوں، دوستانہ مشوروں اور کڑی تنقیدوں سے میں نے کسی نہ کسی طور اثر قبول کیا ہے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد حیدرآباد میں شاعری کی بساط، انہی کے ہاتھ میں آئی اور ابھی تک انہی کے ہاتھ میں ہے۔ آج ان میں سے تقریباً تمام شعراء نے حیدرآباد کے باہر بھی اپنے آپ کو منوالیا ہے ـــــ اب رہے وہ، جو اِن کے علاوہ ہیں ـــــ تو ان میں سے بعض کا شمار "اساتذہ" (اپنے وقت کے) میں ہوتا ہے اور بعض ایسے ہیں جنھیں "ممتاز مقامی شاعر" ترنم گو اور مشاعرہ باز ہونے کا اعزاز حاصل ہے!

کسی کتاب کا زیورِ طبع سے آراستہ ہونا، کسی اہم پراجکٹ کی تکمیل سے کم نہیں۔ یہ کام ایک اچھی ٹیم کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اپنے ساتھ تعاون کرنے والوں کا (اُن میں میرا 'ہمزاد' ہی کیوں نہ ہو) دِل کی تمام تر گہرائیوں سے شکریہ ادا نہ کرنا، میرے نزدیک یا تو شعوری عمل کا نتیجہ ہے یا اخلاقی جرأت کے فقدان کا، یا پھر کسی مصلحت پسندی کا ـــــ خدا کا شکر ہے کہ میں اِن باتوں میں سے کسی ایک کا بھی شکار نہیں۔ اسی لیے سب سے پہلے ڈاکٹر مغنی تبسم کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے کتاب کی اشاعت کے آخری مرحلہ پر اپنے مفید مشوروں سے نوازا ـــــ اپنے ان تینوں شاعر دوستوں، رؤف خلش، اعظم راہی اور علی الدین نوید کا سپاس گزار ہوں کہ انھوں نے اپنی کتابوں کو پسِ پُشت ڈال کر، میرے اِس شعری مجموعہ کی ترتیب و تزئین، کتابت اور پروف ریڈنگ سے طباعت تک کے ہر مرحلہ پر مجھ سے بڑھ کر جانفشانی دکھلائی۔ سلام خوشنویس (جو اِس مجموعہ کے ظاہری حُسن کے ذمہ دار ہیں) کے تعاون کی بُنیاد قطعی تجارتی نہیں بلکہ وہ دیرینہ خلوص اور اُنس ہے جو انھیں مجھ سے ہے ـــــ میں اگر ان کا شکریہ ادا نہ کروں تو وہ بھلے ہی مجھے معاف کر دیں، لیکن شاید میں اپنے آپ کو معاف نہ کرسکوں۔

اِس انتخاب کے آخر میں، میں نے ایسی آراء کو جو پہلے سے میرے ہاں RECORDED تھیں، جمع کر دیا ہے۔ تنقید و تعارف کا یہ انداز بالکل نیا نہ ہوتے ہوئے بھی قدرے الگ نوعیت کا حامل ہے۔ اِسے میں "سمندر" کو "قطرہ" میں دیکھنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش کا نام دیتا ہوں ـــــ اِن آراء میں آپ کچھ اضافہ کرسکیں تو مجھے مسرت ہوگی۔

باتیں تو آپ نے بہت سُن لیں، آئیے اب اُس کرب میں شامل ہو جائیے جس میں، میں پچھلے اُنیس بیس برسوں سے مُبتلا ہوں ـــــ ورق اُلٹیے، پہلی نظم ہے "سمندر کی تعریف میں"۔

آپ کا



نظمیں

۱۹۶۳ء ــ تا ــ ۱۹۷۳ء

سمندر کی تعریف میں!

سمندر،
غور سے دیکھے گا
ہر قطرے کو
چاہے آگ ہو،
پانی ہو یا شبنم!

سمندر،
راستوں پر بیٹھ کر
چہرے پڑھا کرتا ہے
جیسے، جوتشی پڑھتا ہے
ریکھائیں، ہتھیلی کی

سمندر،
رات کو،
دن سے،
جُدا کرتا ہے، جیسے
دُودھ سے مکّھی نکالے کوئی

اِک آواز پر یوں دَوڑ کر آتا ہے
بچّہ ٹافیوں کو دیکھ کر جیسے لپکتا ہے
وہ ہر قطرے کے اصلی رنگ سے واقف ہے
اُس کی آمیزش سے بھی،
ترازو لے کے بیٹھا ہے اور اس کے ہاتھ میں ہے راس،
ہر قطرے کو تُلنا ہے

وہ چاہے آگ ہو،
پانی ہو یا شبنم،
سمندر ہی سے مِلنا ہے

سمندر سے،
زمیں خالی ہے،
اور نہ آسماں خالی،
سمندر ہی رہے باقی!

▲

عطا ہو آنکھ، نابینا ہوں اب تک!

وہ بابِ جبرئیل ـــــ اُس سے ذرا آگے
ہری جالی ہے، جس میں اِک نشاں ہے
وہی چوکھٹ، وہی دَر ہے
وہیں پر مَیں کھڑا تھا
جو دیواریں تھیں آگے،
اُن کے اُوپر
حَریر و اَطلس و کمخواب کے پردے پڑے تھے
بڑھا جب اور آگے
تو پہلے اپنی پلکوں سے سُنہری گرد چُن کر،
مُنوّر پاؤں دیکھے،
اپنی آنکھوں سے اُنھیں چُوما
اُنہی پر اپنا سر رکھ کر،
مَیں روتا جا رہا تھا، یہ کہتا جا رہا تھا،
مدینہ ہی مرا ملجا، مدینہ ہی مرا ماویٰ
مرا کعبہ
پھر اس کے بعد کا منظر ـــــ
مُنوّر ہاتھ اُبھرا
چھا گیا سر پہ مرے پھر آسماں بن کر

خُداوندا،
مری بینائی، میرا نام —— سب کچھ
نثار اِس خواب پر، تعبیر دے دے
دکھا دے جاگتے ہیں پھر
وہی روضہ، وہی گُنبد
وہی جالی، وہی چوکھٹ،
اُسی دَر پر، کھڑے ہو کر،
پُکاروں مَیں،
نواسوں کا نواسہ ہُوں
مجھے جنّت سے منگوا دیجئے گھوڑا
اور اُس پر بیٹھ کر نِکلوں،
زمینوں، آسمانوں کی خبر لاؤں،
ثریا، مُشتری، زہرہ، عطارُد،
مرا پیچھا کریں، میری زمیں تک
نہ آؤں ہاتھ میں اُن کے کہیں پر
نظر کو کیمیا کر دیجئے گا
اسی دن کے لیے زندہ ہُوں اب تک!
توجہ چاہیئے پیاسا ہُوں اب تک!!
عطا ہو آنکھ، نابینا ہُوں اب تک!!!

آسماں کے زوال سے پہلے!

روشنی کی سیڑھیوں سے
جو اُترتی تھی کبھی
کتابوں سے نکل کر
بھٹکتی ہے وہی آواز اب
گر پہاڑوں پر اُترتا یہ کلام
وہ پگھل کر موم ہو جاتے
"مَیں" اگر چاہوں تو پھر
سامنے کی اُس پہاڑی کی کسی چٹان سے
ایک زندہ اُونٹنی نکلے
نیل میں ایک راستہ بن جائے
نیل کو خط لکھنے والا
اب نہیں تم میں، مگر
تمہاری آنکھ کی پُتلی میں پھرتی ہے
ابھی تک

وہ بستی جو زمیں سے ہِل گئی تھی
ذہن کے،
بند دَروازوں پہ دستک دے رہے ہیں
یدِ بیضا، عصا، گلزار، کشتی، گرم بستر
اور وہ ہلتی ہوئی زنجیر

یہ سچ ہے
مَیں تماشہ بیں ہوں لیکن
تم تماشہ کیوں بنے ہو؟
رات کے اندھے کنویں میں جھانک کر دیکھو
تو مَیں ہوں
صُبح کی آنکھوں میں میرا نام لکھا ہے
زمینوں آسمانوں کی قسم ہے
دیکھتے ہی دیکھتے
سارے پہاڑ اُڑنے لگیں گے
اور سُورج کو لپیٹا جائے گا
تب اپنے کھیت تم کیسے بچاؤ گے؟
زمیں کی آخری ہچکی سے پہلے
آسماں گِرنے لگا ہے
اُسے اپنے سَروں پر اب سنبھالو!

▲

بے رنگ ہے کینوس

سلیماں، سبا، دیوزادوں کی بستی
ان آنکھوں کے گہرے کنویں میں
سلگتی ہوی ریت،
پریوں کے اُڑتے ہوے تخت کا عکس ہے
پانیوں میں،

ہرے رنگ کی پیاس،
بے رنگ ہے کینوس،
ڈوبنے کو ہے منظر
شب و روز اُڑنے لگے اور،
سُورج زمیں پر اُترنے لگا ہے

مجھے میری آنکھوں ہی کے ساتھ دفنا کے آؤ
یہ آنکھیں کسی اجنبی کو لگاؤ
تو وہ بھی
زمیں پر اُترتے ہوے سورجوں کو پہن کر جلے گا
ہرے رنگ کی پیاس لے کر مرے گا!



پتھّروں کی نیند

ہم خود اپنے میں سے یوں تفریق ہوتے ہیں
کہ دن،
ڈھونڈتا پھرتا ہے ہم کو
اور شب،
دستکیں دیتی ہوئی تھک سی گئی ہے!

کل جہاں صحرا کی ننگی دھوپ پیتے تھے بدن،
پتّھروں کی تیز نوکیلی زباں،
عُمر کے اِک ایک پَل کو،
کاٹتی تھی
وہ نہیں تھے،
جو زمیں کو پیٹھ پہ لادے ہوئے چلتے رہے تھے!

آج اُڑنا سیکھ کر،
یہ بھُول بیٹھے
اِک پرندے ہی نے ہم کو،
عقل سکھلائی تھی کل،

آج کا اخبار ہیں ہم،
کل ہماری سُرخیاں،
کون جوڑے گا، کہ اس کے سامنے،
اِک نیا اخبار ہو گا اور اس کی سُرخیاں
نیند سے بوجھل زمیں پہ
کون کیا کیا کر رہا ہے
کِس سے پُوچھیں ؟
دو پہروں کے درمیاں لٹکے ہوئے
کاش ہم سب
اپنے اپنے نام کے معنی ہی بن جائیں !



فاصلے

مِری خواہش ہے برسوں سے
خلا میں تیرتا ایسی جگہ پہنچوں
جہاں سے،
اس زمیں پر
لمحہ لمحہ پھیلتے بڑھتے ہوئے
اَجسام کو دیکھوں
وہ پودے ہوں کہ انساں
ان کے بچپن اور لڑکپن کو
نظر کے سامنے بڑھتا ہُوا دیکھوں

اِس انجانے جہاں سے

اور آگے کی جو منزل ہے
وہاں پر
وقت کی رفتار رُک جائے
مَیں اس حد سے پرے جانا نہ چاہوں گا،
فقط اتنا ہی چاہوں گا،
کہ پھر دھرتی پہ لَوٹ آؤں
یہ ممکن ہے
یہاں کے سب در و دیوار کھو جائیں
مجھے پہچاننے والا نہ ہو کوئی
مرے دامن میں جو سکّے ہوں وہ سکّے بدل جائیں!



صَدی کا غم!

اِس صَدی کا غم
وہ بَد بُودار، زہریلا دُھواں ہے
جس سے بنتی اور بگڑتی ہیں
کئی شکلیں،
اَدھوری، نامکمل!
جو ہم سے کہہ رہی ہیں
یہ ہمارے ہاتھ تھے،
یہ پاؤں،
یہ چہرے،
مگر اب ہم دُھواں ہیں،
ہو سکے تو پھر
اسے تم جسم و جاں دے دو
اگر اِتنا نہ ہو پائے
تو، تم بھی چیخ بن جاؤ
دُھواں بن کر بکھر جاؤ
ہمارے ساتھ مِل جاؤ!



کچّی اینٹوں کے پُل!

ہر پتھّر میں چھُپی ہوئی اِک مُورت ہے جو سوچ رہی ہے
سُورج کے آئینے میں، جو شکل بھی ہے
وہ اندھی، کالی
دیواروں سے چپکی ہیں ٹُوٹی پرچھائیں
کچّی اینٹوں کے پُل بنتے ہیں دِن میں
راتوں میں، پانی پر چلتے ہیں سب لوگ
سارے پربت
ساگر پی کر آئے ہیں
تم بَونوں کی بستی میں بھی چھوٹے ہو!

اپنے سائے سے ڈر کر کہتی ہیں فصلیں
سانپ اُگاؤ
جتنے بھی مینڈک ہیں ان کو باہر بھیجو
اپنی اپنی قبر سے اُٹھ کر
راتوں میں کیوں
کتبے لوگ مٹا دیتے ہیں
سادے کاغذ پر
کتنی ہی تصویریں ہیں
رات پگھلتے سورج کا مُنہ دیکھ رہی ہے
اب سو جاؤ!



خاص پانیوں کی آس میں

خُون میں تمہارے ہیں،
کون سے جسیمے کم؟
سُرخ یا سفید؟
ساعتوں کو گھول کر پیو،
کہ دُھوپ تیز ہے
کل جو ننھی کونپلیں تھیں،
بیل بن کے
آسماں کا مُنہ چڑا رہی ہیں آج
روشنی سے دُور
خاص موسموں کے پانیوں کی آس میں،
بند مُنہ صدف لیے
گردسے اَٹی چھتوں سے اپنے سر نکال کر

پھیلتی ہی جا رہی ہیں،
اور تم،
دائیں پسلی ہاتھ میں لیے ہوئے
بائیں پسلی ڈھونڈنے
ہر ایک آسماں کھنگال آئے ہو

شہاب ٹوٹ کر گریں کہ خواب، دیکھتا نہیں،
کوئی، اُداس راستوں کو دیکھ کر،
رُکا نہیں،
زمیں سے آسماں کا تھا کبھی جو سلسلہ، نہیں!
بغیر تیشہ مر سکے کوئی یہاں
وہ داستاں کے شاہزادے ہیں کہاں؟



نئی دُھوپ کی بھیک!

اُجالوں کو مَیں نے،
یہ کہتے سُنا ہے
کہ ہم
تیرگی کے بَدن کو،
اپنی کِرنوں سے سنگسار کر دیں تو بھی
رات کے جتنے بیٹے ہیں سب
کل ہمیں
___ تاریک ناموں سے بُلوائیں گے
اور سنگسار کرنے چلے آئیں گے،
نئی دُھوپ کی بھیک لینے نکل جائیں گے!

▲

تم اندر سے ٹوٹ چکے ہو
اُوپر کی پرتوں میں تم کو ڈھونڈنے والے
کیا پائیں گے !
خالی ذہنوں کی چیخیں
اور صدیوں کی نیند !

اِس پر بھی تم
مِٹی مِٹی تحریریں چُن کر
رنگ بھر دو تو ،
رنگ اُڑ جائیں
پانی مُٹھی سے بہہ جائے
سُورج بھی بجھ جائے !

▲

تیسری آنکھ بھی، رو رہی ہے!

مجھے سوچ کے دائرے سے نکلنا نہ آیا کبھی
مرے خواب اُونچی عمارت سے گِر کر
سڑک پر ہیں بکھرے ہوئے
سامنے کے کواڑوں میں اب
دُھوپ ننگی کھڑی ہنس رہی ہے
دائرے، بڑھتے بڑھتے
کناروں سے مِلنے لگے ہیں

پہاڑی پہ چڑھ کر،
دھندلکے میں لپٹی ہوئی
دُور کی ساری چیزوں کو پہچاننا
کتنا مشکل ہے؟
آبادیوں کے سبھی نام جھوٹے

کھوج اپنی
کہیں کھو گئی
راستوں سے'
کسے اپنے اندر ٹٹولیں
(یونہی بے زبانی کے صحرا میں سمٹے رہیں؟)
سَرابوں کی دہلیز پھر چاٹتی ہے'
لہو ریت کا
اُجالوں کی تحریر'
بوڑھی کتابوں سے مِٹنے لگی'
تیری آنکھ بھی رو رہی ہے!

وہ دِن
جب صبا جذب کر لے گی'
رنگوں کو اپنے بدن میں
آسمانوں میں رکھا ہُوا ہے'
وہ شب'
آئینوں میں ہے بند!!

▲

آتش داں کے اندر!

مَیں زندہ ہُوں
اِک آتش داں کے اندر،
جہاں پر،
وقت جیسی سخت جاں شے بھی،
پگھل جائے،
کہ جس کے سامنے،
یہ آسماں،
اک بیضۂ مور،
اور زمیں،
اِک نقطۂ موہُوم ہے،

دیکھو!

کہ مجھ میں
وقت جیسی سخت جاں شئے
اور زمین و آسماں حل ہیں

مَیں زندہ ہوں
کہ آتش داں ہے مجھ میں!



ایک نظم

تم اگر ہو،
راکھ کا اِک ڈھیر تو پھر،
روشنی کس کا بدن ہے ؟
صرف سرگوشی سے کچھ حاصل نہیں
چیختے لمحوں کے
اِس سیلاب میں
اپنے دھڑوں پر،
جانے کس کے سر لیے پھرتے ہو تم ؟

اژدہے پھیلے ہوئے ہیں
شہر میں،
آنکھ پر باندھے ہوئے پٹّی،

گلے میں سانپ ڈالے
موت کے اندھے کنویں میں،
سارے رشتے اشتہاری بن گئے ہیں
جن پہ ہنستے ہیں،
کھلی سڑکوں پہ چپیاں
پوسٹر

اِس زمیں کو پیٹھ پہ لادے ہوئے،
چلنا ہے تم کو،
روشنی کی سیڑھیاں آواز دیتی ہیں،
سنو!
صرف سرگوشی سے کچھ حاصل نہیں،
چیخ پھنستی ہے گلے میں آج تو،
ہاتھوں سے چیخو!

▲

جواں پیڑ
بوڑھی اُداسی

سمندر بھی پیاسا ہے
پیڑوں کی بوڑھی اُداسی
ہر اک موج سے پُوچھتی ہے
کہ ساحل کے اُس پار
جواں پیڑ کتنے ہیں
بوڑھے ہیں کتنے
سُنا ہے
وہاں،
ہر اِک پیڑ کے جِسم پہ
زمرّد کے پتّے ہیں
سونے کی شاخیں
جڑیں دُور ساتوں سمندر میں پھیلی ہوی ھیں!

ہر اِک موج
ساحل سے ٹکرا کے جب لَوٹتی ہے
یہ کہتی ہوئی لَوٹتی ہے
"سمندر بھی پیاسا ہے
وہ موتیوں کو نِگل کر
سبھی سیپیوں
اور مُونگھوں کو اندھا بناتا ہے
پھر
ریت کی گود میں پھینک دیتا ہے
وہاں پر بھی
پیڑوں کی بُوڑھی اُداسی
ہر اِک موج سے پُوچھتی ہے
کہ ساحل کے اُس پار"۔۔۔۔۔

▲

مٹّی نے رُسوا کر دیا!

تم کہاں تھے
شہر میں جب دُور تک پانی ہی پانی آ گیا تھا!
جس سے بچ کر
لوگ ٹیلوں پر چڑھے جاتے تھے،
ہر سُو،
بھاگتے لوگوں کو پانی ہی نظر آتا تھا
اور وہ،
اس شوق سے اُوپر کو چڑھتے تھے،
گُماں ہوتا تھا اُن کو
آسماں پر کچھ ضروری کام ہے!

مجھ سے دیوانے بہت کم تھے،
جو ہنستے تھے مگر،

تم کہاں تھے؟
وہ بھی تو اِس بھیڑ میں تھے،
جو ہزاروں بار پہلے مَر چکے ہیں
اور کیا ہوگی قیامت
ہم میں بھی
اِک چیز پہلے
اب نہیں،
ہم جو مٹّی کے بنے ہیں،
بس اِسی مٹّی نے رُسوا کر دیا،
کاش! پانی کے بنے ہوتے سبھی،

تم کہاں تھے......؟

▲

چمکتی ریت

دِن کی پلکیں ہیں نیند سے بوجھل
شام آنچل پسار آئی ہے
وَادیِ شب ہے مُنتظر اس کی

دُور حدِّ نگاہ تک ہر سُو
کھیت، میدان، پیڑ، سنگِ میل
راستہ جیسے مانگ میں سیندور
لَوٹتے ہیں سبھی تھکن سے چُور
اور اُس جا، جہاں زمیں، آکاش
ایک دوجے کو چُومتے ہیں وہیں
مہرِ خُوں ناب، بن گیا مہتاب !!



آنے والی صَدی میں!

اِن کیوبیٹر میں رکھا ہُوا ایک بچّہ
یہی پُوچھتا ہے
کہ وہ تجربہ تو وہاں پر
سمندر کی تہہ میں ہُوا تھا
مگر،
میری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے؟

اِس صَدی میں تو ہم
سائنس کے ساتھ ایٹم کے ذرّات کو پی رہے ہیں
مگر آنے والی صَدی میں یہ ہو گا،
کہ انسان
پانی پہ اپنے گھروں کو بنانے لگیں گے،
عصافیر بن کر خلاؤں میں اُڑنے لگیں گے!

▲

ا INCUBATOR

آسیب زدہ

مجھے محسوس ہوتا ہے،
کہ جیسے
کوئی میرے جسم میں بیٹھا
مسلسل ہنس رہا ہے
اور بدن کی ساری دیواروں سے چپکی ہیں
کئی آنکھیں
مرے سر پر،
کئی سمتوں سے پتھر آرہے ہیں اب
وہ منظر
کس نے دیکھا ہے
جہاں سورج کو نیند آئے،
وہیں سے،
آنگنوں میں، خود بخود گرتے رہیں پتّھر
وہ منظر
دوسرا کوئی نہیں، مَیں ہُوں،
مجھے دیکھو!

▲

سوچتے ٹیلے!

گونگی دیواروں کی بستی سے پرے
ایک جنگل ہے
جہاں
کچھ بات کرتے پیڑ ہیں
جن کے پیروں سے بندھے ہیں تار
سینوں سے لگی ہیں تختیاں
جن پہ کوئی نام لکھا ہے
نہ رستے کا نشاں
بیچ میں اِک کھوپڑی ہے
کھوپڑی کی دونوں جانب ہیں
دو سُوکھی ہڈیاں
رقص کرتی ہے فضا میں تیز لُو
دُور جلتے آسماں کی گود میں
سوچتے ٹیلوں پہ منڈلاتے ہیں گِدھ !!

▲

ایک نظم

خَلا کے سمندر میں بھی
تَیرتے ہیں حوادث'
کوئی آج کنکر نہ پھینکے'
سفینہ خداؤں کی بستی سے آگے چلا ہے
زمیں ایک نقطہ بنی'
دوسری اِک زمیں سے'
چمکتے ہیں چھوڑے ہوئے نقشِ پا
مگر بات کیا ہے'
فلک ہی کو تکتے ہیں اب تک
ٹھٹھرتے بَدن
پُل کے اُوپر بھی'
اُس پار بھی!!

▲

پانی پانی آئینہ

کل الف ننگا پھرا تھا میں،
تو میرے واسطے،
آئینے کے شہر میں
کس لیے بوئے گئے تھے
پتھروں کے بیج
قہقہوں کی،
تیز چبھتی دھوپ میں
کیسے جھلسایا گیا میرا بدن
نوچ کر،
ساری کتابوں سے مجھے پھینکا گیا کیوں ؟

آج کپڑوں میں برہنہ ہوں
تو دیکھو !

سی رلیے ہیں اس زمیں نے،
اپنے لب،
کالے دھبّوں سے برستا نُور بھی،
سوچ کی جلتی چٹانوں سے،
لپٹ کر سو گیا ہے!

اور مَیں یہ سوچتا ہوں
کل تو میرا جِسم گھایل تھا
مگر،
آج میری رُوح زخمی ہو گئی ہے
اور مَیں
بے لباسی میں برہنہ تھا،
کہ اب!؟



ایک نظم

آسماں، راحتوں کی جواں سیج تھا
روشنی پُوچھتی ہے کہ مَیں
کیسے اندھا ہُوا
مَیں تو اندھا ہی ٹھہرا اگر
وہ جو بِینا ہیں کیوں
سات رنگوں کو بھی،
ایک ہی جانتے ہیں!

روشنی کل جہاں دُھوپ تھی،
آج سایہ بنی
کس کے پَیروں سے چل کر
یہاں تک چلے آئے تم
رات کے ساتھ مجھ کو نہ جگنے کی خواہش
کتنی مہنگی پڑی ہے
کوئی سُورج تمہارے بدن میں بھی پکنے لگا ہے
یہ زمیں
ایک کانٹوں بھرا تاج کیوں بن گئی ہے؟

نقشِ ناتمام!

چھت پہ دیواروں پہ دَر پہ
کھڑکیوں میں
میز و کرسی پہ
کتابوں اور رسالوں میں
جدھر دیکھوں اُدھر
ایک تصویرِ حِنا
ایک سایہ، ایک عکس
ایک نقشِ ناتمام
یُوں اُبھرتا ہے سَدا
جیسے ہو میرا خُدا!

▲

تُم سے کِس نے کہا تھا؟

تُم سے کِس نے کہا تھا؟
کہ اِس دَوڑ میں
ہانپتے کانپتے
تم بھی شامِل رہو
ہانپتے کانپتے
تم بھی،
اس دَوڑ میں ۔۔۔۔

اب بھی پڑتے ہیں،
پیچھے کی جانب قدم
یہ تھکن، ایک فطری نتیجہ ہے،
اب تھک گئے ہو تو آرام لو،
تم سے کِس نے کہا ۔۔۔۔؟

▲

یہ حسرت کہ ۔۔۔!

کبھی دُھوپ،
پردے کے پیچھے سے چھنتی ہوئی
نیم وا، روشنی،
کبھی بند کمروں کی،
پیلی تمازت،
کبھی، آنکھ میں،
نیلے پن کی علامت!

یہ حسرت،
کہ یہ صاف ہو جائے،
دُھل جائے پانی سے
اور پاک ہو جائے،
باقی ہے اب تک!

▲

اب
کیا
بچا
ہے؟

——— بُو ہے ابھی تک،
دھوئیں کی،
فضاؤں میں،
اب کیا بچا ہے؟
دھواں،
ضبطِ تحریر میں
آ بھی جائے تو کیا ہو!

▲

واہمہ!

بلندی آسمانوں کی نہ ناپو
زمیں سے جو بلندی دیکھتے ہو
وہ سورج سے بہت ہی مختصر ہے
جو کچھ نظروں کے آگے ہے
وہ ہے بھی اور نہیں بھی ہے
زماں کی اور مکاں کی یہ جو گردش ہے
یہ گردش، بس ہماری ہے
یہ پیمانے
جو دن اور رات کو تقسیم کرتے ہیں
ہمارے ہی لیے ہیں
اور ہمیں نے تو بنائے ہیں

خلاؤں میں
جہاں، چھوٹے بڑے سورج، ستارے، کہکشاں
رقصاں فروزاں ہیں
وہاں اپنی زمیں کی داستاں جھوٹی
وہاں کا واقعہ اپنی زمیں پر اک کہانی ہے!
بلندی آسمانوں کی نہ ناپو! ▲

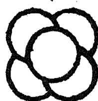
رات نظمیں ہوئیں
صبح کو بھول بیٹھا
کچھ ایسے
کہ جیسے کوئی خواب دیکھا ہو
دن میں !



نظمیں

موم ہے آسماں،
زمین ہے آگ،
اور ہم چل رہے ہیں پانی پر !





نثری نظمیں

۱۹۷۴ء ـــ تا ـــ ۱۹۷۹ء

دیا سلائی کے پیچھے چھپکے ہوئے
ریڈ نائٹ (Red Knight) وہسکی
ریزہ ریزہ کر دینا
اِس بات کی علامت ہے
کہ تم
یہاں نہیں ہو!

ایسا کیوں ہوتا ہے
کہ ہم
جو کچھ کہنا چاہتے ہیں
وہ کہہ نہیں پاتے
اور تم کو جو سننا چاہیئے

اُسے تم سُن نہیں سکتے،
کہتے اور سُننے کے درمیان
صرف اداکاری حائل ہے
یا کچھ اور
اور اگر
صرف اداکاری ...

ہم تو
اس اسٹیج پر
اس لیے نہیں آئے ہیں
کہ اپنے آپ کو چھپا کر
کسی اور کو پیش کریں
تو پھر
کیوں نہ وہ ڈوریاں ہی کاٹ دیں،
جو دکھائی نہیں دیتیں!!



پتھر، ابابیلیں اور ہاتھی!

وہ لشکر
اور وہ ہاتھی،
آگے بڑھ نہ سکے تھے
اُس پتھر کو اُکھاڑ پھینکنے کے لیے
جسے چادر میں لپیٹ کر رکھا گیا تھا

اُن پر،
آسمان میں،
اُڑتی ہوی ابابیلوں نے
اپنی چونچوں اور پنجوں سے،
کنکریوں کی بارش کی تھی!

آج پھر ویسا ہی
ایک لشکر،
ہوا میں اُڑتے ہوئے،
ہاتھیوں کے ساتھ،
بڑھ رہا ہے
لیکن
وہ ابابیلیں کہاں ہیں
جنھوں نے،
آسمان سے کنکریوں کی بارش کی تھی،
اور اب،
وہ پتّھر؟



دوسری قیامت سے پہلے

ہم سب،
بیج ہیں کبھی نہیں رُکتے
اُوپر اور نیچے
ایک غیر منقسم چکّر!

دِن کبھی ختم نہیں ہوتا،
نہ ہی رات ختم ہوتی ہے
اس بے روشن سیّارے میں

اور یہاں سے دُور
جہاں انسان نے
اپنے چمکتے نقشِ قدم چھوڑ آئے ہیں
حیات کی جُستجو
چاند کے زخموں کا علاج،
سُوکھے پتّوں کی طرح گرتے دنوں کا غم،
آسمانوں میں بند،
سمندروں کو پی جانے کی تمنّا
روشنی میں بھیگنے کی خواہش،

تلاش،
رُوح کی،
جسم میں،
مُشترک ہے
صدیوں سے

اِس پر بھی
جانے کیوں کچھ لوگ
قیامت سے ڈر کر
پہاڑوں پہ،
چڑھ رہے ہیں!

کیوں نہ ہم
جو، اپنے ہی جسموں میں قید نہیں،
نیچے
اُتر کر
اُس قیامت کا
انتظار کریں،
جو،
ابھی نہیں آئی!



کاغذی پیرہن!

مجھے یہ بات،
صرف اخباروں سے معلوم ہوئی تھی،
کہ وہاں کے پیڑوں پر،
لعل و زمرّد جیسے جو پھل تھے،
وہ کسی داستان کے،
طلسمی پھلوں کی طرح،
ذرا سا چھُوتے ہی غائب ہو چکے ہیں
(حالانکہ اُن کے بیج اُسی زمین میں بوئے گئے تھے)

یہاں تو آج بھی،

"مداری"

نیولے اور سانپ کا تماشہ دکھاتے ہیں
اور اُسے دیکھنے کے لیے
سڑکوں کے کنارے بھیڑ سی لگ جاتی ہے
اور ہمیشہ کی طرح،
واپسی پر،
لوگوں کی جیبیں خالی ہی ہوتی ہیں،

تم نے یہ لکھا ہے،
کہ راستے کے پتھر ہٹ جانے کے بعد،
مداری کا تماشہ دیکھنے
ضرور آؤ گے
لیکن میں
وہاں آکر،
اُن پھلوں کو کیسے دیکھ پاؤں گا،
جو ذرا سا چھوتے ہی -----

اپنی چند نظمیں بھیج رہا ہوں،
میری بات،
ان کے ہر لفظ میں پوشیدہ ہے
انھیں پڑھ لینا!

▲

عالمِ ارواح کا ایک منظر!

روشنیوں سے گھرے
ایک بہت بڑے میدان میں،
کسی نے،
ایک پُرانا کیلنڈر لٹکا کر،
وہاں موجود،
تمام افراد سے
یہ کہا ہے،
کہ وہ،
اُس میں،
آج کا دِن اور آج کی تاریخ تلاش کریں
لوگ اُس کیلنڈر کا،
ایک ایک ورق اُلٹتے ہوئے،

مایوسی کے سمندر میں غرق ہو رہے ہیں'
اُن کی یہ کوشش
ایسی ہی ہے'
کہ جیسے کوئی'
کسی بند گھڑیال سے'
صحیح وقت کی توقع کر رہا ہو!

ایسا محسوس ہو رہا ہے'
کہ وہاں موجود تمام افراد'
اپنے ہی جنازے میں شریک ہیں'
اور
اپنے ہی دفن ہونے کے منتظر!



لمحے کی موت!

مَیں اپنے جسم کو
تنہا چھوڑ کر
بھٹک رہا ہوں

اُچھلتے ہوئے دائروں
اور نقطوں پر
اسکرٹ کی زِپ کھولتے ہوئے پیاسے ہاتھ
اسٹرپ ٹیز ڈانس
اتھینا اور انجلک کے جسموں کی قوسِ قزح
آوازیں
"بیرا" ایک وِہسکی لانا
"مَیں خوابوں کا پرستار نہیں
وہ میجر تو جھک مارتا ہے'

تیری تو ماں کی ۔۔۔
"خیر جانے بھی دے یار
ہم سب تو یہاں بیوقوف بننے ہی کے لیے آتے ہیں
اتنے پیسوں میں تو ہمیں ۔۔۔"

مَیں اب اُس میز کے قریب ہوں،
جہاں سے اُٹھ کر،
ابھی ابھی ایک لڑکی باہر گئی ہے
مَیں اُسی جگہ کو دیکھ رہا ہوں
جہاں وہ بیٹھی ہوئی تھی

مَیں پھر اپنے جسم میں لوٹ آیا ہوں
اور یہ سوچ رہا ہوں
کہ لمحے کی موت پر کوئی کیوں نہیں روتا؟

ریستوران میں اب دھواں گونج رہا ہے!

▲

سیڑھی

جہاں مَیں ہُوں،
وہاں،
وقت،
ایک اُونچی پہاڑی پر چڑھ کر بیٹھ گیا ہے،
اُسے،
میرے لفظ بھی
[جو کشتی میں لدی ہوئی کتابوں کے
حکمراں ہیں]
ابھی تک
نیچے نہیں اُتار سکے!

میرا دِن
اپنے ہاتھ میں ایک لاٹھی لیے چل رہا ہے،

رات،
سُورج کے سات سوالوں کو
پُورا کرنے کے لیے نکل گئی ہے،
اور مَیں،
نیند میں چلتا ہُوا
اپنے آپ کو،
آسمان میں دفن کر آتا ہوں
جاگتا ہُوں تو پھر،
خود کو زمین کے خول ہی میں پاتا ہوں،

جب میرے لفظ
وقت کو،
پہاڑی سے نیچے اُتار لیں گے،
میری جڑیں
سات سمندروں تک پھیل جائیں گی
اور مَیں،
اپنے ہی لفظوں سے،
ایک ایسی سیڑھی بناؤں گا
جو، زمین سے آسمان تک پہنچتی ہے!!



سمجھتے کیوں نہیں!

سمجھتے کیوں نہیں
وہ بانس پر چڑھا ہُوا،
کوئی آدمی نہیں،
اُسے
جھُوٹ مُوٹ کے کپڑے پہنا کر
اُس کے سَر پر
ایک ہیٹ[1] رکھ دی گئی ہے
مُنہ میں دَبا ہُوا سگریٹ بھی،
چاک[2] کا ایک ٹکڑا ہے،

تم شاید،
اُس کے ہاتھ میں لالٹین دیکھ کر،
یہ دھوکہ کھا گئے
کہ وہ .....

سمجھتے کیوں نہیں!

▲

1. Hat 2. A piece of chalk.

ویسا ہی تو ہے!

سبھی کچھ
ویسا ہی تو ہے،
کچھ بھی نہیں بدلا،
وہی طوفان،
وہی سوراخوں والی کشتی،
وہی ٹوٹی ہوی پتوار،
ایک ناخدا کے بدل جانے سے،
ہواؤں کا رُخ
بھلا کیسے بدل جائے!



یہ کاغذ کی---!

یہ کاغذ کی دیواریں
نہ میری پناہ گاہ ہیں
نہ تمہارا حافظہ

میرا سفر تو
ذہن سے
ذہن تک کا ہے
تم اگر
مجھے سوچ سکتے ہو
تو سوچو
یہ کاغذ کی ------

تم
بھی
عجیب...!

کبوتر بھی،
آسمان پر، منڈلاتے ہوئے
گھرے سُرخ بادلوں کو دیکھ کر،
اپنے پَر باندھ لیتے ہیں
اور کابک میں بیٹھے ہوئے،
غُٹرغُوں غُٹرغُوں .....

خیر جانے دو

تم بھی عجیب پرندے ہو،
کسی بھی موسم میں،
پانی پر،
اپنے پر مارنے سے باز نہیں آتے!

▲

وجود کی شناخت!

اِدھر آؤ،
ذرا اور قریب
ذرا اور،
اب میرے ٹکڑے سمیٹ کر،
لے جاؤ
اور اُن لوگوں میں بانٹ دینا
جو یہ سمجھتے تھے،
کہ اتنی بلندی سے گرنے پر،
مَیں
باقی ہی نہیں رہوں گا!



حکایت خلقت کی!

اُن میں سے بعض تو،
گھروں کی چھتوں پر چڑھ گئے تھے،
بعض درختوں کی ٹہنیوں سے
میووں کی طرح لٹک گئے تھے،
غرض یہ،
کہ خلقت تمام وہاں موجود تھی،
جب ہاتھی کے پاؤں سے باندھ کر،
مجھے لایا گیا تھا

اُس وقت تو سب خاموش تھے،

لیکن آج جب مَیں
ہَوا میں اُڑ رہا ہُوں،
تو وہ سب،
آسمان کی طرف دیکھ دیکھ کر رو رہے ہیں،
اور مسلسل بولنے کے مَرض میں،
خود کو کھو رہے ہیں!!



اُن کے
ساتھ!

اُن کے ساتھ
مَیں نے بھی،
ہوش مندی کے
بیج بوئے تھے،

وہ ساری فصل
جو مَیں نے کاٹی
یہ تھی،
کہ مَیں
پانی کی طرح آیا تھا،
اور ہَوا کی طرح جاتا ہوں!

▲

دیوتاؤں کا کیا ہے؟

دیوتاؤں کا کیا ہے ؟
وہ تو
ہنسنے اور رونے کی
درمیانی کیفیت کا شکار رہتے ہیں
اور زمین کے اندر،
دوسرے دیوتاؤں کے لیے
ہتھیار بنانے میں مصروف رہتے ہیں !

آتش فشاں
اُن کارخانوں کی چمنیاں ہیں
جہاں ہتھیار تیّار ہوتے ہیں !

کتبہ!

میرے اندر تعفّن زدہ ایک لاش تھی'
جسے'
ایک اَبدی گڑھے میں پھینک آنے والوں کے نام'
عَین' میم' رے' اور الف سے شروع ہوتے ہیں

آج مَیں۔
ایک ایسا ہَرا بھَرا درخت ہُوں
جو پھَل پھُول تو دیتا ہے'
سایہ نہیں!

مجھے بھی کاندھا دینا ہے،
اُن لاشوں کو،
جو موجود تو ہیں لیکن دکھائی نہیں دیتیں،

مَیں اگر ایسا نہ کرسکا،
تو میرے کتبے پر لکھوا دینا
"یہاں ایک ایسا شخص دفن ہے
جس کے نام کے پہلے ہی حرف کے اعداد،
سب سے زیادہ تھے،
یعنی پُورے ایک ہزار،
لیکن وہ،
ایک بھی نہ تھا!"

▲

تمہیں پتہ بھی ہے!

مُڑے ہوئے کانوں
اور کھُلے ہوئے جبڑوں والے'
کُتّوں کی'
زنجیر تھامے'
سحر کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے
اکثر' مرد دکھائی دیتے ہیں

لیکن' کُتّوں کے ناخنوں کے نشان تو
بیشتر' عورتوں ہی کی پیٹھ پہ پائے جاتے ہیں

اِس میں تعجب کی کیا بات ہے
تمہیں پتہ بھی ہے' یہ کونسی صدی ہے؟ ▲

میرے جُوتوں پر ---!

میرے جُوتوں پر
اب اتنی گرد جم گئی ہے
کہ مَیں،
یہ سوچنے پر مجبُور ہو گیا ہوں
کہ اُسے،
جھاڑنے کی کوشش کروں
یا جُوتے ہی بدل ڈالوں!

▲

مَیں وہ درَخت ہُوں!

مَیں وہ درخت ہُوں
جس نے کبھی
پت جھڑ کی صورت ہی نہیں دیکھی
اور تم
وہ ببُول
جو سُوکھتی ہی چلی جا رہی ہے
میری یہ خواہش کہ تم
ہَری بھری ہو جاؤ
تمہاری یہ تمنّا
کہ مَیں سُوکھ جاؤں

میں نہ سُوکھ کر ببُول بن سکتا ہُوں

اور نہ اب
تم پہ بہار آ سکتی ہے
ایسے میں
بہتر تو یہی ہو گا
کہ ہم ایک دوسرے سے علیٰحدہ رہیں
مگر اِس احتیاط کے ساتھ
کہ اس کی خبر
نہ پانی کو ہو سکے، نہ ہوَا کو!



اُسی کو
دُعا
دیتا ہُوں ....

سارا دِن
سُورج، میری آنکھوں کے راستے
جِسم میں اُتر کر،
تلوؤں تک پہنچ جاتا ہے
اور سمندر کا سارا کھارا پانی
جِسم میں بھر جاتا ہے !
میرے یہ دونوں ہاتھ
کب تک پتوار کا کام دیں گے،
خُدایا !
اب تو صرف رات ہی
میرے تلوؤں کو سہلاتی ہے
اور میرے جِسم سے

کھارا پانی نکال کر پھینک دیتی ہے
اُسی کو دُعا دیتا ہوں،
خُدایا!

صُبح ہوتے ہی،
پھر سُورج،
میری آنکھوں کے راستے،
جسم میں اُتر کر،
تلوؤں تک پہنچ جاتا ہے،
اور رات ۔۔۔۔۔
اُسی کو دُعا دیتا ہوں،
خُدایا!!



دِن
جب اپنا لباس اُتار دیتا ہے
تو رات آ جاتی ہے'
لیکن رات'
کبھی اپنا لباس نہیں اُتارتی'
اس کا لباس اُتار پھینکنے کے لیے تو
لوگوں کا جاگنا بہت ضروری ہے!



نظم لیں

میرا ایک ہاتھ
پتھر کے نیچے ہے
دوسرا،
تمہارے آگے'

کیا تم
اُس ہاتھ کو بچا سکتے ہو'
جو پتھر کے نیچے دَھرا ہے؟



وہ دیکھنا!

مجھے اپنے
مُردہ بھائی کا گوشت کھانے کی عادت نہیں،
لیکن
اِسے کیا کیا جائے
کہ بعض گِدھ،
خود مجھے مُردہ سمجھ کر،
میرے اطراف منڈلا رہے ہیں!

وہ دیکھنا، اُن کے لیے
زمین
اپنا مُنہ کھولے کھڑی ہے!



چراغوں کی لَویں بُجھنے پر
دُھواں کیوں اُٹھتا ہے،
یہ جاننا چاہو،
تو مجھے دیکھ لو!



نظمیں

چاند اور سُورج کے،
ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ہو،
تو تم بھی،
وہی پڑھو،
جو مَیں پڑھتا ہوں!



ابھی تو میرے شہر میں!

وہ تو ہمیشہ نقشے ہی کی آنکھ سے دیکھتا اور اُسی کے پیروں سے چلتا ہے
تم نے، کسی بیرونی سیّاح کو، کسی نئے شہر میں
کسی بھی جگہ کا پتہ پُوچھتے ہوئے دیکھا ہے؟

لگتا ہے تم نے سفر ہی نہیں کیا!
پہلے تو اپنے مُلک میں شہر ہی نہیں ہیں،
اور اگر ہیں بھی ـــــ تو وہاں
راستہ پُوچھنے والے کو صرف گھُور کر دیکھا جاتا ہے
(جیسے اُس کی پیشانی پر راستہ لکھا ہو)
تمہاری تو پیشانی بھی نہیں!

اگر تمہیں نقشہ دیکھ کر راستہ طے کرنا نہیں آتا،
تو راستہ تمہیں طے کر لے گا، اور ......
یہ تو اچھا ہوا کہ تم میرے شہر میں ہو،
آئندہ کسی نئے شہر میں جانا
تو اپنی پیشانی،
اور اُس شہر کا نقشہ اپنے ساتھ ضرور رکھ لینا!

اچھا چلو، پہلے کچھ کھا پی لیں
پھر تمہیں اپنا شہر دکھانے لیے چلتا ہوں
یا پھر وہ راستہ ......
ابھی تو میرے شہر میں ...... ! ▲

اِس
بیمثال
شہر میں!

حکیم یُوسف حسین خاں کے اِنتقال پر

جن سیڑھیوں کو پھلانگ کر تم نے،
اپنے جِسم کو یہیں چھوڑ دیا تھا،
اُن پر
ابھی تک تمہارے گیلے پیروں کے نشان ہیں،

ایسا لگتا ہے، جیسے
کسی نے تمہیں آواز دی تھی
اور تم
ایش ٹرے میں اَدھ جلا سگریٹ چھوڑ کر
[اپنے مخصوص انداز میں سر کو ایک طرف جُھکائے]
اُٹھ کھڑے ہوئے تھے،
اور چُپکے سے،
آواز دینے والے کے ساتھ
کہیں نکل گئے!

اتنی دیر
بس اتنی ہی دیر ہوی تھی
کہ اس
بے مثال شہر میں
جہاں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ابھی
کارخانوں کی گھڑگھڑاہٹ
خون کی روانی میں شامل نہیں ہوی ہے
یکلخت تمہارے سارے دوستوں کو موت آگئی!

شاعری کی زلیخا کے یوسف
تم بہت خوش قسمت تھے
کہ تمہاری موت کے تیسرے دن بھی
تیس آنکھوں نے
پندرہ ہاتھوں کو
تمہاری تازہ قبر پر
چادرِ گل چڑھاتے دیکھا تھا!!

▲

ایک نظم

میرا سر
ایک درخت سے لٹکا ہُوا ہے
گلے سے،
تازہ لہُو کی بُوندیں
ٹپک کر
زمین میں
جذب ہو رہی ہیں
دھڑ، اکیلا
آپ ہی آپ چلتا ہُوا،
سمندر سے ملنے جا رہا ہے!

▲

مُسافر!

مَیں خود اپنے پیچھے چلتا ہُوا،
اپنے ہی کاندھے پر
اپنا ہی ہاتھ رکھ دیتا ہُوں
تاکہ دیکھنے والے،
یہ نہ سمجھیں
کہ مَیں،
بالکل اکیلا ہُوں!



زینہ زینہ راکھ!

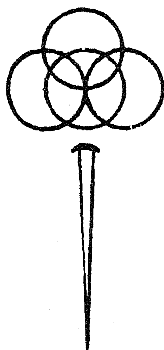
وہ ایک ایسی عمارت تھی،
جس کی
صرف بائیس سیڑھیوں تک
سُورج کی روشنی پہنچی تھی

اور پھر
یکایک
وہ شعلوں سے گزُر کر
زمین سے مِل گئی

مَیں جو اُس پہ

زینہ زینہ چڑھتی ہوئی روشنی کو دیکھتا رہا تھا'
آج اس کی راکھ کے پاس کھڑا
سوچ رہا ہوں
کہ میرے
اور اس کی ارتھی کے درمیان
جو چیز حائل تھی'
وہ کب تک روا رہے گی
اور لوگ
مجھے کاندھا دینے سے کیوں روک رہے تھے ؟





غزلیں

۱۹۷۰ء ـــ تا ـــ ۱۹۷۹ء



سُورج کو کیا پتہ ہے کدھر دُھوپ چاہیئے
آنگن بڑا ہے اپنے بھی گھر دُھوپ چاہیئے

آئینے ٹوٹ ٹوٹ کے بکھرے ہیں چارسُو
ڈھونڈیں گے عکس عکس مگر، دُھوپ چاہیئے

بھیگے ہوئے پَروں سے تو اُڑنے نہ پائیں گے
کاٹو نہ اِن پرندوں کے پَر، دُھوپ چاہیئے

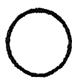
ہم سے دریدہ پیرہن و جاں کے واسطے
یاقوت چاہیئے نہ گہر، دُھوپ چاہیئے

سُورج، نہ جانے کونسی وادی میں چھُپ گیا
اور چیختی پھرے ہے سحر، دُھوپ چاہیئے

اِک نیند ہے کہ آنکھ سے لگ کر نِکل گئی
اب رات کا طویل سفر، دُھوپ چاہیئے

پانی پہ چاہے نقش بنائے کوئی متین
کاغذ پہ مَیں بناؤں مگر دُھوپ چاہیئے

○



دَرد کے رشتے جہاں بھی جائیے پائندہ ہیں
جیسے سُورج کی شعاعیں، ہر جگہ رقصندہ ہیں

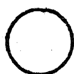
جسم سے باہر نکل کر آنکھ پھرتی ہی رہی
اور جب لَوٹی تو اس سے خواب کیوں شرمندہ ہیں

راکھ ہو تم اپنے جسموں سے تو ہم ہیں روشنی
سارے منظر اِک ہماری خاک سے تابندہ ہیں

سایہ سایہ جانے والو، دُھوپ کے رستے چلو
تا کہ یہ محسوس ہو جائے ابھی دِل زندہ ہیں

آفریدہ ہوں خود اپنی آنکھ کے شہتیر کا
اس لیے میری نگاہوں میں سبھی رخشندہ ہیں

اپنی آنکھوں میں کتابیں لے کے پھرتا ہُوں متین!
جن کو پڑھ کر آسماں زادے بہت شرمندہ ہیں



خواب آنکھوں کی گلی چھوڑ کے جانے نِکلے
ہم اِدھر نیند کی دیوار گرانے نِکلے

دُھول رستے کا مقدّر ہے تو رستہ کیا ہے
بس یہی بات زمانے کو بتانے نِکلے

جب پہاڑوں سے مِلی داد ہُنر کی اپنے
داستاں ہم بھی سمندر کو سُنانے نِکلے

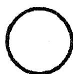
رنگ سے رنگ جُدا ہونے کا منظر دیکھا
تیرگی اور شفق صِرف بہانے نِکلے

جب سمندر پہ چلے ہم تو یہ صحرا چُپ تھے
اب پہاڑی پہ کھڑے ہیں تو بُلانے نکلے

آسماں جس کی زمیں ہے وہ پرندہ ہُوں میں
جانے کیوں لوگ یہاں دام بچھانے نکلے

کوئی چہرہ نہ دے آواز کسی کو سے متینؔ
شام ہوتے ہی چراغوں کو بجھانے نکلے





کشتی کے ساتھ وہ بھی گیا، جھُولتے ہو کیوں
ساحل کے آس پاس، سدا، گھُومتے ہو کیوں

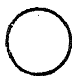
اُڑ جاؤ شاخ سے کہ وہ موسم نہیں رہا
سُوکھا ہے پیڑ، تیز ہَوا، جھُولتے ہو کیوں

آنکھوں میں ہے وہ راستہ کب سے کھُلا ہُوا
پلکوں پہ رُک کے اُس کا پتہ، پُوچھتے ہو کیوں

منظر بدل نہ جائے کہیں، اتنی دیر میں
دیکھو سفر تمام ہے اب اُونگھتے ہو کیوں

ہم کو تو اپنے ہونے پہ شرمندگی سی ہے
تم کاغذی لباس ہو، یُوں پھُولتے ہو کیوں

جنگل میں دفن کر کے جسے آئے ہو میتین
سڑکوں کی رونقوں میں اُسے ڈھونڈتے ہو کیوں



آنکھ کی پُتلی میں سُورج، سَر میں کچھ سودا اُگا
پانیوں میں سُرخ پودے، دُھوپ میں سایا اُگا

آسماں کی بھیڑ میں تو اس لیے سوچا گیا
اس زمیں کی چھاتیوں سے نُور کا چشمہ اُگا

نیند میں چلنے کی عادت، خواب میں لکھنے کا فن
ایک جیسی بات ہے تو آتشِ نغمہ اُگا

مَیں نے اپنی دونوں آنکھوں میں اُگائے ہیں پہاڑ
تیری آنکھوں میں سمندر تھا، وہاں صحرا اُگا

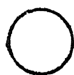
سبزۂ بیگانہ بن کر جی لیا تو کیا جیا
خود کو بو کر اس زمیں سے اِک نیا چہرا اُگا

دُھوپ جیسے قہقہے ہیں، ریت جیسی بات ہے
تُو اگر غوّاص ہے تو ریت میں دریا اُگا

یہ زمیں بوڑھی ہے اس کو پیٹھ سے اپنی اُتار
آسماں کو جیب میں رکھ لے، نئی دُنیا اُگا

ہم تو خود اظہار ہیں اپنے زمانے کا مستین
بُجھ گئے آواز کے شعلے نیا لہجہ اُگا

○



جزیرے ہوں کہ وہ صحرا ہوں، خواب ہونا ہے
سمندروں کو کسی دِن سراب ہونا ہے

سوال پُوچھنے والو، تمہیں بھی آخرِ کار
رہینِ منّتِ بارِ جواب ہونا ہے

کھنڈر میں بیٹھ کے رونے کی خُو نہیں جاتی
تمہاری آنکھ پہ شاید عذاب ہونا ہے

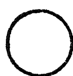
وہ ظُلمتیں جو اُجالوں کے گھر میں رہتی ہیں
اُنھیں بھی مثلِ سحر بے نقاب ہونا ہے

وہ دن جو نیلی کتابوں میں بند ہے اس کو
ابھی تو میرے لیے بے حجاب ہونا ہے

ابھی تو خواہشِ بے دست و پا سلامت ہے
ابھی کچھ اور یہ خانہ خراب ہونا ہے

یہ شاخ شاخ پرندے پکارتے ہیں مستین
ہمیں تو شاخ سے گر کر گلاب ہونا ہے

○



دُھوپ کا احساس جانے کیوں اِسے ہوتا نہیں
وقت آوارہ ہے، ٹھنڈی چھاؤں میں سوتا نہیں

جھوٹ کی دیوار سے لٹکے ہوئے جِسموں کے دِن
ہو گئے پورے کہ سچ تو، شب میں بھی سوتا نہیں

ہم تکا کرتے ہیں کھڑکی سے اُترتے چاند کو
دَوڑ کر اُس کو پکڑ لیں، یہ کبھی ہوتا نہیں

دِل عجب پتھر ہے پانی سے پگھل جائے کہیں
اور کبھی جو آگ میں رکھ دیجیے، روتا نہیں

روشنی پھوٹے قلم کی آنکھ سے کیوں کر متین
آنسوؤں کے بیج دل میں جب کوئی بوتا نہیں



پَروں کو اب نہ پھیلاؤ پرندو
ہے بارش تیز گھر جاؤ پرندو

بہت ہی خُوب ہے یہ چہچہانا
پہاڑی گیت بھی گاؤ پرندو

سمندر دانہ دانہ جب بکھیرے
سمندر میں اُتر جاؤ پرندو

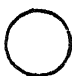
وہ موسم اب نہ آئیں گے پَلٹ کر
چلو اب لوَٹ بھی آؤ پرندو

تمہارے واسطے، یہ آسماں ہے
زمیں پہ تھوکتے جاؤ پرندو

تمہیں سے ہم نے سیکھا تھا، سمجھنا
ابھی کچھ اور سمجھاؤ پرندو

مجھے سرخاب کے پَر کی ہے خواہش
کہیں سے ڈھونڈ کر لاؤ پرندو





کوئی صورت آشنا ملتا نہیں ہے کیا کریں
چلتے چلتے بھیڑ میں کھو جائیں اب ایسا کریں

دیکھنا باہر، کوئی سائل کھڑا ہے، دیر سے
یہ مکاں خالی ہے کہہ دیں اور اسے چلتا کریں

پہلے خود کو اک پہاڑی سے گرا لیں اس کے بعد
نیچے آکر لاش کا اپنی ہی نظّارا کریں

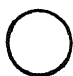
خود تعاقب میں رہیں اپنے تو پھر کچھ ڈر نہیں
یہ زمیں پیچھا کرے یا آسماں پیچھا کریں

جن کتابوں کو کوئی پڑھتا نہیں، اُن کو پڑھیں
ایسی باتیں جو کوئی لکھتا نہیں، لکھا کریں

آسماں اِک اجنبی ہے، اِس زمیں پر آج بھی
کیوں نہ اب اس کا سمندر سے کوئی رِشتا کریں

اپنے خاکے میں خود اپنا رنگ بھرنے کو مستین
آؤ خود کو اب سرِ بازار ہم رُسوا کریں

○



زمیں کے ساتھ فلک کے سفر میں ہم بھی ہیں
قفس نصیب سہی بال و پر میں ہم بھی ہیں

وہیں سے لوٹ گئی راستوں کی تنہائی
جہاں پہ اُس نے یہ جانا سفر میں ہم بھی ہیں

تُو وہ شجر جو سدا برگ و بار دیتا ہے
مثالِ آبِ نہاں اِس شجر میں ہم بھی ہیں

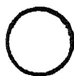
جسے کہیں سے سمندر نے لا کے پھینک دیا
تمہارے ساتھ اِک ایسے ہی گھر میں ہم بھی ہیں

کتاب تھے تو پڑھے جا سکے نہ دُنیا سے
لو اب چراغ ہوئے رہ گُزر میں ہم بھی ہیں

خیال آگ ہے، شعلہ ہے فِکر، لَو، الفاظ
یہ سب ہُنر ہیں تو پھر اس ہُنر میں ہم بھی ہیں

متین شہر بھی صحرا نژاد ہے اتنا
کہ سنگ و خِشت میں دیوار و دَر میں ہم بھی ہیں





اکیلا گھر ہے کیوں رہتے ہو، کیا دیتی ہیں دیواریں
یہاں تو ہنسنے والوں کو رُلا دیتی ہیں دیواریں

انھیں بھی اپنی تنہائی کا جب احساس ہوتا ہے
تو گہری نیند سے مجھ کو جگا دیتی ہیں دیواریں

مجھے ماضی کا کھلتے حال سے رشتہ عجب دیکھا
کھنڈر خاموش ہیں لیکن صدا دیتی ہیں دیواریں

جو چلنا ہی نہ چاہے روک لیتے ہیں اُسے ذرّے
سمندر کو سفر میں راستہ دیتی ہیں دیواریں

ہَوا کے زخم سہہ کر، بارشوں کی چوٹ کھا کھا کر
چھتوں کو روزنوں کو آسرا دیتی ہیں دیواریں

اُترتی اور چڑھتی دُھوپ کی پہچان ہے اِن کو
ابھی دِن کتنا باقی ہے، دکھا دیتی ہیں دیواریں

وہ ساری گُفتگو جو بند کمرے ہی میں ہوتی ہے
مَیں جب باہر سے آتا ہوں، سُنا دیتی ہیں دیواریں



رہوں گھر میں تو میرے سر پہ چادر تان دیتی ہیں
سفر پہ جب نکلتا ہوں دعا دیتی ہیں دیواریں

مَیں اس چلچلاتی دھوپ میں سایہ انہی سے ہے
میں جب بھی لوٹتا ہوں حوصلہ دیتی ہیں دیواریں



پہلے بن جاتے تھے جن کے واسطے پیکر چراغ
مجھ سے نابینا کو ہیں، اب راہ کے پتھر، چراغ

کیوں کسی کو ڈھونڈتے ہو ہاتھ میں لے کر چراغ
تم اگر سُورج ہو تو آئیں گے خود چل کر چراغ

دیکھنا اُس کو اگر ہے ان چراغوں کو بجھاؤ
کیسے دیکھو گے اُسے تم سامنے رکھ کر چراغ

جن کی قسمت میں نہ سُورج ہے نہ کوئی چاند ہے
دُھول اُن کے واسطے ہے آئینہ، ٹھوکر چراغ

اِک اِنہی سے روشنی ملتی ہے مجھ کو راہ بھی
ہاتھ میں میرے نہیں یہ بادہ و ساغر چراغ

اب جو لوٹا ہوں تو سب حیرت سے تکتے ہیں مجھے
جام و مینا، گنبد و محراب و بام و در چراغ

آج تو اُن کی نظر کے واسطے سو رنگ ہیں
کل پرندوں کے لیے ہوتے تھے، بال و پر چراغ

وہ جو سُورج ہیں مگر جن کے گھروں میں رات ہے
ہنس لیا کرتے ہیں اُن کے حال پر اکثر، چراغ

شب تو اندھی ہے، رہے گی عُمر بھر اندھی مگر
یا جلُوں میں شام سے یا پھر جلیں دِن بھر چراغ

○

کہتی ہے خلقِ خدا!

○ لاحول ولا قوۃ ـــــ یہ بھی کوئی شاعری ہے۔ مینڈک، سانپ، اژدہے ... پتہ نہیں شاعری کے نام پر تم کیا کچھ کہتے ہو! نیند میں بھی کسی کو اس طرح بڑبڑاتے نہیں سُنا، میرے تو کان پک گئے سُنتے سُنتے، میری ایک بات مانو ـــ تمہارے ہاں جب کوئی تازہ نظم ہو، تو مجھے مت سُنانا۔ سُناؤ تمہارے اُنہی بے بہرہ شاعر دوستوں کو، جو تمہاری خرافات سُن کر پہلے تو تمہارا مُنہ تکتے ہیں، پھر کہتے ہیں "واہ! یہ ہوئی نا کوئی بات"! اور پھر ایک ساتھ کئی آوازیں بلند ہوتی ہیں ـــــ "بھابی، چائے"! اور میں اُن سب کے لیے چائے بناتے بناتے تھک جاتی ہوں، چولھے میں جائے ایسی شاعری!

ـــــ میری بیوی سیّدہ فرحانہ بانو ـــــ

★ دسمبر ۱۹۶۸ء میں بالکل پہلی مرتبہ، میں نے آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے نیرنگ پروگرام سے اپنا کلام سُنایا تھا میرے بڑے ماموں، ممتاز افسانہ نگار عاتق شاہ، اُن دنوں بیوپلز کالج ناندیڑ پر لکچرار تھے، اپنے ایک خط مورخہ ۷ ار دسمبر ۶۸ء میں انھوں نے لکھا:

○ "غیاثؔ بیٹے! میں نے تمہارا ریڈیو پروگرام سُنا۔ میرے ساتھ اقبالؔ صاحب اور چند احباب بھی تھے۔ لب ولہجہ اور طرزِ اظہار تو تمہارا منفرد ہے ہی، لیکن تمہاری آواز بالکل تمہاری آواز تھی۔ اگر مائیک کے فرق کو نظر انداز کر دیا جائے تو تم نے سُنایا تو اچھا، لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ تمہیں مائیک اور ریڈیو کا بُری طرح احساس ہو گیا ہے اور میں سمجھتا ہوں یہ بالکل فطری بات ہے، کیونکہ یہ تمہارا پہلا موقع ہے۔ لیکن آئندہ تمہیں اِس کا خیال رکھنا چاہیئے۔"

ـــــ عاتق شاہ ـــــ

★ میرے ایک دوست ہیں، وقار اعظمی۔ کسی ریڈیو پروگرام کے دوسرے ہی دن جب ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے نہایت سنجیدگی سے یہ بات بتائی:

○ "غیاثؔ! میں جب بھی ریڈیو پر تمہارا نام سُنتا ہوں، فوری ریڈیو بند کر دیتا ہوں۔ چنانچہ کل بھی میں نے ایسا ہی کیا تھا!" [قہقہہ ـــ جس میں میں بھی شامل تھا!]

ـــــ وقار اعظمی ـــــ

★ مقام: 34 .B فرسٹ فلور، حضرت نظام الدینؒ، ویسٹ، نئی دلی 13۔ نومبر ۷۷ء، وقت، رات ۱/۲ ۱۲ بجے میرے ماموں، ممتاز صحافی احمد معظم صاحب کا مکان ـــــ اقبال عمانی اور بچے سو چکے تھے اور میں انھیں "لا = انسان" سے ن۔م راشد کی چند نظمیں سُنا رہا تھا۔ وہ نہ صرف بغور سُن رہے تھے بلکہ بے ساختہ داد بھی دے رہے تھے۔ پھر یکایک مجھ سے نظمیں سُنانے کی خواہش کر بیٹھے، میں تو جیسے اسی بات کا منتظر تھا، شروع ہو گیا۔ اور جب دو نظمیں اور دو غزلیں سُنا چکا (اِس دوران وہ سر جھکائے بالکل خاموش بیٹھے رہے، پس منظر میں زور سے دانت کٹکٹانے کی آواز ـــــ آنسو ـــــ جو آج بھی میری ہتھیلی میں جذب ہیں!) تو کہنے لگے:

○ "ارے تُو تو شاعر ہے رے شاعر! مجھے نہیں معلوم تھا کہ تُو اِتنا ... تُو اِتنا سا تھا، اِدھر دیکھ اِتنا کہ جب تیری ماں یعنی میری بہن ـــــ میری جیلانی آپا ـــــ سب اُسے دیوانی پکارتے تھے اور وہ تھی بھی دیوانی!ـــ

ہاں ــــ تو وہ تجھے میری طرف اُچھال دیتی تھی، اور میں ــــ تجھے سنبھال نہیں سکتا تھا ــــ خوب موٹا تھا تُو ــــ اِے ے سا (ہاتھوں سے حلقہ بناتے ہوئے) میں نے تو اپنی زندگی میں، آج تک ایک مصرع بھی نہیں کہا ــــ پتہ نہیں تُو کس طرح اتنی اچھی ... اارے تُو تو شاعر ہے رے شاعر!"

ــــ احمد معظم ــــ

★ میرے بچپن کے ایک دوست ہیں جو روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن میں ملازم ہیں۔ غلطی سے انھوں نے کسی مشاعرے میں مجھے سُن لیا، اس کے کچھ دنوں بعد، جب ملاقات ہوئی تو، یوں گویا ہوئے ۔

◯ "بکواس کرتے ہو، علاج کرواؤ اپنے دماغ کا ــــ تم جو کچھ کہتے ہو، اگر اسی کا نام شاعری ہے تو پھر اُردو شاعری کا خدا ہی حافظ ہے ــــ اور طُرفہ تماشہ یہ کہ مشاعرے میں ایسی نظمیں سُناتے ہو!"

ــــ حبیب المرسلین ــــ

★ ۱۹۶۶ء میں "ادارۂ مصنفینِ نو حیدرآباد" کی جانب سے کوآپریٹیو اساس پر شائع کردہ شعری انتخاب "آبگینے" (مرتب: حسن فرخ) میں، ہندوستان کے بارہ مختلف شعراء کے علاوہ میری بھی چند نظمیں شامل تھیں۔ (جن میں سے ایک بھی اِس مجموعہ میں اپنے لیے جگہ نہ بنا سکی) اُس پر تبصرہ کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا:

◯ "غیاث متین کی سنجیدگی اور لہجہ کا وقار قابلِ لحاظ ہے۔" ماہنامہ 'شب خون' فروری ۱۹۶۷ء

ــــ شمس الرحمٰن فاروقی ــــ

★ مقام: رائل ہوٹل کا ایک کمرہ (جہاں قاضی سلیم ٹھہرے ہوئے تھے) تاریخ ۲ر نومبر ۱۹۷۱ء، گیارہ بجے دن رؤف خلش، حسن فرخ، یوسف اعظمی، علی الدین نوید اور میں، اُن سے ملنے وہاں پہنچے۔ وہ ہم سب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ چائے کے دوران باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ایک مختصر سی شعری نشست۔ ہم سبھوں کو انھوں نے بغور سُنا اور خود اپنی تازہ نظمیں سُنائیں۔ جب ہم چلنے لگے تو ہر ایک کو اپنی تحریر اور دستخط کے ساتھ "نجات سے پہلے" کا ایک ایک نسخہ عنایت کیا۔ مجھے کتاب دیتے ہوئے انھوں نے یہ لکھا:

◯ "غیاث متین کی خدمت میں، جن کی نظمیں سُن کر یہ یقین ہو گیا کہ جدید شاعری کا یہ نیا باب، تاریخ ادب اُردو میں سُنہرا ہوگا۔"

ــــ قاضی سلیم ــــ

★ اپنے ایک مضمون "حیدرآباد میں اُردو شاعری ۔۱۹۶۰ء کے بعد" مطبوعہ ماہنامہ 'پیکر' دسمبر ۱۹۷۱ء میں اسلم عمادی نے لکھا:

◯ "غیاث متین ایک سنجیدہ اور گہری فکر کے حامل شاعر ہیں، وہ روایات اور میلانات کی پابندی سے گھبراتے ہیں۔ ان کی نظمیں بکھری ہوئی ہوتی ہیں اور ان کی سوچ علامات کی پیداوار ہے۔ متین کی نظموں میں شکست و ریخت کا عمل جاری رہتا ہے، جس کی وجہ سے ان کے قول میں بوقلمونی پیدا ہو جاتی ہے۔ متین کے لہجہ میں عجوبیت بھی جھلکتی ہے اور کھُردراپن بھی ــــ بعض اوقات وہ اپنی شاعری میں غیر شاعرانہ علامات بھی استعمال کر جاتے ہیں۔ ان کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ان کی نظمیں "کچی اینٹوں کے پُل"، تیسری آنکھ بھی رو رہی ہے، صدی کا غم: اور، خاص پانیوں کی آس میں" قابلِ مطالعہ ہیں۔ اِس بات کا قوی امکان ہے کہ اپنی نظموں کے ذریعہ دعوتِ فکر دینے والا یہ شاعر اپنے قول کی ــــ FREQUENCY میں اضافہ کرے گا

اور اردو نظم کے دامن کو مالا مال کرے گا۔ ـــــــ اسلم عمادی ـــــــ

★ ۱۹۷۸ء کی بات ہے۔ رائل ہوٹل کے ایک کمرے میں محمود ہاشمی ٹھیرے ہوئے تھے۔ ویسے تو ہم دن بھر ساتھ گھومتے رہے تھے، لیکن رات میں دوبارہ رؤف خلش، علی الدین نوید، یوسف اعظمی اور مَیں وہاں پہنچے عوض سعید، خالد قادری اور جمیل شیدائی کچھ دیر بعد آئے بشہباز حسین اور خواجہ احمد فاروقی پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔ بیشتر احباب کے ہاتھوں میں چراغ تھے جو روشن ہو چکے تھے۔ اُن چراغوں کا نور جب حلق سے نیچے اُترا تو ہندوستان کے جدید شعراء کی بات چل پڑی۔ خالد قادری نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے محمود ہاشمی سے کہا کہ "یہ بھی تو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں" محمود ہاشمی نے اور کیا کہا مجھے یاد نہیں رہا۔ ہاں اُن کا یہ جملہ یاد رہ گیا:

○ "ہاں ہاں یہ بھی تو ہے ـــــ یہ مگر بہت دُور تک جائے گا" ـــــــ محمود ہاشمی ـــــــ

★ پس منظر: رؤف خلش کا مکان: کچھ ہی دیر پہلے ناصر کرنولی، پونم کے لیے رؤف خلش، علی الدین نوید اور مجھ سے چند نظمیں اور غزلیں لے چکے ہیں۔

منظر: کھانے کی میز پر، رؤف، نوید، منظہر الزماں خاں، مَیں اور ناصر کرنولی موجود ہیں۔

رؤف نے پوچھا، کیا بات ہے، ناصر بھائی آپ کچھ کھا نہیں رہے ہیں؟ ناصر کرنولی نے نوالہ مُنہ تک لے جاتے ہوئے ہاتھ روک لیا، کہنے لگے:

○ "کیا کھاؤں بھائی! غیاث متین کی نظمیں پڑھنے کے بعد تو بھوک ہی مرگئی!"
(میرے ساتھ سبھوں نے قہقہہ لگایا اور ناصر صاحب کا نوالہ حلق سے نیچے اُتر گیا۔)

ـــــــ ناصر کرنولی ـــــــ

★ سلام صاحب کی خوبی یہ ہے کہ لکھنے کے دوران یہ پڑھتے بھی ہیں۔ ان کے اندر بیٹھا ہوا ایک شاعر ہے جو موروثی بھی ہے اور فطری بھی ـــــ اور جب وہ باہر آتا ہے تو شفیق حیدر آبادی بن جاتا ہے۔ سلام خوشنویس اور شفیق حیدر آبادی بہت کم ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور جب ملتے ہیں تو اس طرح کی رائے کا اظہار ہوتا ہے، ملاحظہ ہو اِن کی رائے:

○ غیاث متین صاحب! مَیں آپ کی اہلیہ کی 'رائے' سے متفق ہوں ـــــ مگر ـــــ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ہر بڑے شاعر' یا 'بڑی شاعری' کی مخالفت کی شروعات پہلے گھر ہی سے ہوی ہے۔ مَیں نے جناب مجروح سلطان پوری اور جناب شاذ تمکنت کے شعری مجموعے بھی لکھے ہیں۔ ان مجموعوں کو لکھتے وقت مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ مَیں شعری مجموعے لکھ رہا ہوں لیکن آپکے مجموعہ کی خوشنویسی کے دوران' مَیں نے 'خود کلامی' کی سی کیفیت زیادہ محسوس کی۔ ممکن ہے یہ بات اس لیے محسوس ہوی ہو کہ آپکے پاس "روایتی انداز" سے' شعوری طور پر گریز کا پہلو ملتا ہے۔ ویسے "عطا ہو آنکھ" "نا بینا ہوں اب تک" سے آپکی شعری بصارت کا پتہ چلتا ہے۔ اللہ کرے، یہ نظم آپ کی حیات کا اثاثہ بن جائے۔ ـــــــ سلام خوشنویس ـــــــ

★ ڈاکٹر مغنی تبسم کا ایک خط:

جناب غیاث متین صاحب!

○ "شعر و حکمت" کے لیے آپ کی نظمیں ملیں۔ تینوں نظمیں (زینہ زینہ راکھ، پتھر ابابیلیں اور ہاتھی

اور خود شناسی کی ایک نظم) مجھے پسند آئیں، انھیں آپ نے نثری نظموں کا نام دیا ہے ۔ مجھے "نثری نظم" کی اصطلاح پر اعتراض ہے کہ اس میں تناقض پایا جاتا ہے ۔ اب یہ بات بڑی حد تک تسلیم کر لی گئی ہے کہ شاعری کے لیے آہنگ کے کسی روایتی نظام کی پابندی ضروری نہیں ہے ۔ پھر سیدھے سیدھے آپ اپنی تخلیقات کو نظم ہی کہیے ـــــــ آج دُنیا کی بیشتر زبانوں میں روایتی عروض کو مُسترد کر دیا گیا ہے اور اس کی صراحت کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی کہ ان نظموں میں بحر اور اوزان کی پابندی ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے ۔ عروضی سانچوں سے مکمل انحراف کے بعد اگر کوئی تحریر نثر کے مقابلہ میں شعری تخلیق کے طور پر اپنی شناخت باقی رکھ سکے اور روایتی آہنگ سے قطع نظر، نظم کے دوسرے لوازم اس میں موجود ہوں تو وہ نظم کہلانے کی مستحق ہوگی ۔ اس نقطۂ نظر سے آپ کی یہ تخلیقات شاعری کی ذیل میں آتی ہیں اور نظم کہلانے کی مستحق ہیں ۔

اُردو میں اس طرز کی نظموں کو رواج دیا جائے تو ہماری شاعری اظہار کے نت نئے امکانات سے روشناس ہو سکتی ہے ۔ روایتی اوزان کا سہارا لیے بغیر نظم میں آہنگ اور تنظیم کو قائم رکھنا مشکل کام ہے ۔ آپ کی نظموں میں داخلی آہنگ اور لہجے سے جو اثر پیدا ہوا ہے، کسی بحر کے استعمال سے پیدا نہیں ہو سکتا تھا ۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے یہ نظمیں محض تجربے کی خاطر نہیں لکھی ہیں بلکہ تجربے کے موزوں اظہار نے ان نظموں کی شکل اختیار کر لی ہے ۔ ان خوبصورت نظموں کی تخلیق پر، میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں ۔ ـــــــ مغنی تبسم ـــــــ

★ مقام: ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ ۔ تاریخ ۲۰ اپریل ۱۹۷۴ ۔ وقت : ۷ بجے شام
انجمن معیارِ ادب کے پہلے اجلاس میں، میری شاعری پہ کی جانے والی ڈاکٹر عالم خوندمیری کی تقریر سے اقتباس

○ نئی حسیت، ایک مبہم اصطلاح ہے، یہ ایک ادبی تہذیب کی تاریخ کا تسلسل ہے، اسی لیے ایک طرف تہذیبی تاریخ سے مربوط ہے تو دوسری طرف، ایک نئے دور کا آغاز بھی ۔ یہ کُلّی عالمی حسیت کی جُزو بھی ہے اور مقامی عصری تقاضوں کا جمالیاتی اظہار بھی ۔ اسی لیے یہ نئے پیکر بھی تراشتی ہے اور روایت سے مربوط پیکروں کو نئی علامتوں کی صورت بھی عطا کرتی ہے، اسی مقام پر ترسیل ممکن بھی ہوتی ہے اور ترسیل کے مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں ۔

غیاث متین، اسی نئی حسیت کے شاعر ہیں، ان کا اسلوب، اس نئی حسیت کا اظہار ہے، اسی لیے مجھے اُن کے اسلوب میں ایک "شخصیت" نظر آتی ہے ۔ میں پُرانی بات نہیں دُہرا رہا ہوں کہ اسلوب شخصیت کا اشاریہ ہے ۔ کہنا یہ ہے کہ اُن کا اسلوب تو ایک شخصیت ہے ۔ اُن کے علائم مجرّد نہیں ہیں، صرف ذہن کی کارفرمائی کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ اُن میں خوابناک حسّی پیکروں کی سی کیفیت ہے ۔ یہ لاشعور سے اُبھرتے ہیں لیکن ایک ایسا شعوری رنگ اختیار کر لیتے ہیں، جن میں لاشعور کا عکس برقرار رہتا ہے ۔ غیاث متین کی شاعری اُردو کی اس نئی روایت کا تسلسل ہے، جس کا آغاز ن ۔ م راشد سے ہوا ۔ اس نئی روایت میں انفرادی اظہار کے لیے ابھی لامحدود فضا ہے ۔ غیاث متین نے اجتہاد بھی کیے ہیں اور شخصی علامتوں کی تخلیق بھی کی ہے، یہیں ان کی شاعری میں ایک خوشگوار ابہام پیدا ہوتا ہے ۔ اس ابہام کا نتیجہ ہے کہ قاری ایک جمالیاتی حیرت کے عالم میں پہونچتا ہے، حیرت نہ ہو تو فن کہاں ! اِن کے علائم، استعارے اور ان کے تراشے ہوئے حسّی پیکر قاری سے صبر کا مطالبہ کرتے ہیں ۔ صورت اور معنی کے درمیان فاصلہ، اچھے فن کی ایک خصوصیت ہے ۔ غیاث متین کی شاعری اس فاصلے کی ایک علامت ہے ۔ ـــــــ عالم خوندمیری ـــــــ

- نام: سید غیاث الدّین
- وطن: حیدرآباد
- تاریخ پیدائش: ۱۰ر نومبر ۱۹۴۲ء
- تعلیم: ایم۔ اے (عثمانیہ) گولڈ میڈلسٹ
  - بی۔ ایڈ (سری وینکٹیشورا یونیورسٹی)
  - یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے فیکلٹی امپرومنٹ پروگرام (F.I.P) کے تحت، ٹیچر فیلوشپ پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے "ن۔ م راشد" پر تحقیقی مقالہ کی تیاری میں مصروف۔

زیرِ نگرانی:
ڈاکٹر مغنی تبسم
ریڈر شعبۂ اُردو، جامعہ عثمانیہ

- ملازمت: لکچرر شعبۂ اُردو۔ جامعہ عثمانیہ
- پتہ: ۵۴۴-۸-۱۶ جدید ملک پیٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۳۶ (آندھرا پردیش۔ انڈیا)
- پہلی مطبوعہ تخلیق:

نظم "صدائے جرس" ماہنامہ "صبا" اکتوبر، نومبر ۱۹۶۴ء

زیرِ ترتیب

- ن۔ م راشد، ایک تجزیاتی مطالعہ
- دوسری شناخت (مضامین اور تبصرے)
- چہرہ در چہرہ (ادبی اور غیر ادبی شخصیتوں پر خاکے)